OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

عبداللہ حسین کے ناولوں میں مذہب تصوف اور سیاست کے معنیاتی پیراڈائم

Meaningful Paradigm of Religion, *Tasawwuf* and Politics in the Novels of Abdullah Hussain

Kausaar Parveen

Doctoral Candidate Urdu, Government College Women University Faisalabad

Dr. Sadaf Naqvi

Assistant Professor/ Chairperson Department of Urdu, Government College Women University Faisalabad

Abstract

With his efforts of half a century, Abdullah Hussain has put history in front of his fellow Nasr generation and future generations with his dream consciousness and waking life. By removing many layers layer by layer, he exposed it in front of us as if it was in my heart too, highlighted all aspects of life and presented his stories in the form of art. He will always live because of his unique style, Urdu manners and light have been given to him that till today his art and thought are criticized by critics from different dimensions. He is a creator as well as a historian and a researcher. And have a thorough understanding of the basic teachings of their service.

Keywords: History, Different Dimensions, Creator, Highlighted, New Generation, Basic Teaching, Fellow, Exposed

تمہید

ہندوستان کا معاشرہ صدیوں تک اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے۔ آقا اور مالک کے اسلامی اصول وضوابط برصغیر کے مقامی لوگوں سے میل نہیں کھاتے تھے۔ استعماری قوتوں نے یہاں قدم جما کر افراد معاشرہ کی ذہنی تربیت ایسے خطوط پر کرنی شروع کی کہ آقا بہت اونچی مسند پر جا بیٹھا اور غلام تک اُس کی رسائی مشکل بنا دی گئی وہ ذہنی پسماندگی کا ایسے شکار ہوئے کہ آج تک خود کو غلام اور مظلوم سمجھتے ہیں اور برملا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم بھکاری ہیں اور بھکاری اپنی زندگی کی ترجیحات خود متعین نہیں کر سکتے کیونکہ بھکاریوں کو چوائس کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ عبداللہ کی نثر ڈپٹی نذیر احمد اور سر سید احمد خان کی طرح کسی نہ کسی حد تک مقصدیت کے دائرے میں گھومتی نظر آتی ہے۔ اُن کے کردار وہی کچھ بولنے لگ جاتے ہیں جو عبداللہ حُسین اُن سے بلوانا

CC BY

چاہتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُن کے ناولوں کے اہم کردار شعوری اور لاشعوری طور پر بے چین اور مُضطرب ہیں۔ مذہبی حوالے سے بھی اُن کے دل کی تاریں کسی عقیدے کے ساتھ مضبوطی سے نہیں بندھی۔ متنوع ثقافتوں اور مذاہب میں سے وہ نمائندہ اہم کرداروں کے لیے مسلم کرداروں کو ترجیح دیتے ہیں اور اُن کے ذریعے اپنی فکری جہتوں کو سامنے لاتے ہیں پروفیسر غلام جیلانی اصغر نے عبداللہ حُسین سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے:"عبداللہ حُسین نسل نو کو اپنا انفرادی تشخص برقرار رکھنے کی دعوت دیتا ہے وقت ایک سا نہیں رہتا نشیب و فراز زندگی کے ساتھی ہیں۔ وقت کو ثبات حاصل نہیں ہے۔ عبداللہ حُسین نے نثر سے وہ کام لیا ہے جو ڈاکٹر علامہ محمد اقبال شعر و شاعری سے لیا کرتے تھے۔ عبداللہ حُسین کا اسلوب بھی مقصدیت کے گرد گھومتا ہے۔ اس کا ہر عمل ایک مثبت دائرے کا پیروکار ہے جو اس نے نسل نو کے گرد گھمار کھی ہے۔"(1)

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کہتے ہیں کہ عبداللہ حُسین کے ناولوں میں ادب، تہذیب، رومانس، مذہب، تاریخ، تصوف اور سیاست کے سب زاویئے واضح اور روشن ہیں۔ عبداللہ حسین کے ذہن میں جو مذہبی کشمکش اُس دور میں چل رہی تھی۔ وہ نعیم کے کردار کے حوالے سے اُداس نسلیں میں نظر آتی ہے۔ اُداس نسلیں سے مذہب کی امثلہ ملاحظہ کیجئے:

> "ایک نئی مصیبت کھڑی ہوئی ہے۔"، "کیا؟"، "ہندوٗ مسلم سوال"، "اول۔۔۔۔۔"، "دلی میں فساد ہوئے ہیں۔ مسجد کے آگے باجا بجاز پڑ گئو کشی پر اب یہاں پر بھی کچھ لوگ آ گئے ہیں، جو ان چیزوں کو ہوا دے رہے ہیں۔" نعیم کا جی چاہا کہ ان لوگوں کے متعلق کچھ پوچھے لیکن اس موضوع سے اسے جو ہچکچاہٹ اور نامعلوم سی دہشت تھی اوپر آ گئی اور وہ چپکا بیٹھا رہا۔ "یہ چیزیں صحت مند تحریکوں کو تباہ کر دیتی ہیں۔" ماسٹر نے پھر بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اسے زیادہ دیر تک نہ کھینچ سکا اور بات جلد ہی ختم ہو گئی۔"(2)

"اُداس نسلیں" جو اپنے عہد کا سیاسی اور معاشرتی مرقع ہے اس پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ عبداللہ حسین نے ہندوستانی سیاست و معاشرت میں مذہب کا عمل دخل جو دو قومی نظریے کی بنیاد تھا اس عنصر کو نظر انداز کیا ہے مذہب کا تذکرہ کچھ جگہوں پر سرسری طور پر سامنے آتا ہے۔ کرداروں کے مذہب کے حوالے سے عبداللہ حسین انگریزوں کے ساتھ بظاہر دوستی کا دم بھرنا جو اس وقت مجبوری تھی کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں اور پنجاب سکھوں کے ساتھ بھائی چارے کی فضا کی تصویر کشی تھی۔ بعد ازاں "نادار لوگ" میں سکھ کردار اپنے سابقہ پڑوسیوں سے ملنے پاکستان آتے ہیں مگر "ہندوٗ" کرداروں کا اُن کے تمام ناولوں میں داخلہ بند ہے۔ صرف "اُداس نسلیں" میں "ٹھاکر داس" ہندو کردار کے طور سامنے آتا ہے جس سے نعیم نفرت کرتا ہے اور ڈاج دے کر اُسے مروا دیتا ہے۔ سیکولرازم اور "دہریے" کے طور پر مچھیرا سامنے آتا ہے: "تم ہندو ہو یا مسلمان ؟" نعیم نے جلدی سے سوال کیا۔ "آہا۔۔۔۔۔ یہ اچھا سوال ہے۔" وہ انگلی اٹھا کر ہنسا۔ "یہ اچھا سوال ہے۔ واقعی۔ لیکن مجھے پتا نہیں۔ یہ کچھ اور ایسا ہے کہ مصروف ہی رہا۔ میرا باپ بھی مصروف آدمی تھا۔ مچھیرے کا کام دراصل جان توڑ کام ہوتا ہے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں پر تم دھیان ہی نہیں دے سکتے۔" اس نے گورے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ مجھے کچھ نہیں کہتے۔"(3)

اوپر والے پیرگراف میں دل چسپ اور فلسفیانہ نوعیت کی صورتحال سامنے آتی ہے کہ مچھلی فروش اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ ہم زندگی کی بھاگ دوڑ میں مذہب جیسی اِدھر اُدھر کی باتوں پر دھیان ہی نہیں دے سکے۔ یہ ہندوستان کے پسے ہوئے طبقات کی آواز ہیں کہ وہ پیٹ کی آگ بجھانے کی تگ و دو میں کسی اور طرف حتیٰ کہ مذہب کی طرف سے بھی غافل ہو چکے ہیں۔ ہندوستان میں ان گنت اسرار تھے۔ یہ بھیدوں اور عمیق سربستہ رازوں کی سرزمین تھی لیکن عبداللہ حُسین اپنے قاری کو علمی اور فلسفیانہ

اصطلاحات میں نہیں اُلجھاتے بلکہ نبض پکڑ کر مرض کی نشان دہی کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اُن کے ہاں ہندوستان کے بے شمار مذاہب اور عقائد میں سے کسی پر بھی بحث نہیں ملتی۔ صرف "اسلام" خدا اور رسول پر کہیں کہیں بات کرتے نظر آتے ہیں۔ مذہب اُن کا اپنا بھی اوڑھنا بچھونا نہیں تھا بلکہ زندگی کے دوسرے وراثتی لوازمات میں سے ایک لوازمہ تھا۔ مذہب کے بارے میں اُنکے خیالات کی جھلک اُداس نسلیں میں ملاحظہ کیجئے:

"وہ گلاس کو ہاتھوں میں پھراتے ہوئے وہ پلنگ کی پٹی پیر یڈ گئے اور بولے: "مذہب آج بھی ہماری مدد کر سکتا ہے۔ سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے اس دور میں بھی مذہب اعلیٰ ترین قوت ہے۔ ایک ڈاکٹر کی زبان سے یہ سن کر تمہیں تعجب ہو گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ روحانی طمانیت، بلڈ پریشر کو معمول پر لانے میں مدد گار ثابت ہو سکتی ہے۔"(4)

"نعیم دوبارہ بے چینی سے ہنسا۔ بیماری ایک ناگہانی آفت ہے یہ کبھی منصوبہ بنا کر نہیں آتی۔ نہ کسی منصوبہ بندی کے ساتھ اس کا مقابلہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مقابلہ کرنا ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہوتا۔ جیسے ایکا ایکی یہ آتی ہے اسی طرح ایکا ایکی اپنی قوت مدافعت کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ یہ قوت کسی بیرونی ادارے یا ڈاکٹر یا ہسپتال سے نہیں آتی ہمارے اور آپ کے اندر موجود ہوتی ہے۔ ہم میں سے بعض اس سے آشنا ہوتے ہیں اور بعض نا آشنا۔ آج تک کوئی آلہ جراحی یا کوئی دوا ایسی ایجاد نہیں کی گئی جس میں عبادت سے بڑھ کر Healing Power ہو۔ مذہب۔۔۔۔"(5)

"اُداس نسلیں" میں ڈاکٹر انصاری جیسے بھرتی کے کردار کو زبردستی ٹھونس کر مذھب کے حوالے سے خوامخواہ کی بحث کروائی گئی ہے شاید اُنھیں محسوس ہو گیا تھا کہ اتنے ضخیم ناول میں کہیں کوئی بھی مذہبی افکار نہیں ہیں۔ لیکن اپنے اِرد گرد والے مذاہب جن میں ہندوازم، بدھ مت، عیسائیت، پارسی مذہب، سکھ ازم یا کسی بھی مذھب کے عقائد قدیم یا مختلف مذاہب کے صحائف جیسا کہ ملکہ شاستر، دھرم شاستر، مہابھارت اور پرانوں وغیرہ کا کہیں بھی کسی ناول میں ذکر نہیں ہے۔ اسلوب اور عہد کا چولی دامن کا ساتھ ہے فنکار کی سماجی شخصیت ماحول اور معاشرے کے دیگر عوامل سے تشکیل پاتی ہے اور شخصی اسلوب سے آگے زمانی اسلوب و قومی اسلوب کی بنیاد سماجیات پر ہے جب کوئی ادیب کسی بھی خیال، فکر یا فلسفے کو سامنے لاتا ہے۔ تو وہ ترسیل اس کے ذہن اور لاشعور سے ہوتی ہے وہ تخیل کو حسن کارانہ تربیت سے پیش کرتا ہے جو اُس نے معاشرتی عوامل سے شعوری طور پر اخذ کیا ہوتا ہے۔ فاضل مصنف کے ہاں اکثر جگھوں پر گہری متانت، فکر اور فلسفے کی پیچیدگیاں نظر آتی ہیں: "تو مذہب کی کیا ضرورت ہے؟" نعیم نے چڑ کر پوچھا۔ "مذہب؟ خوب۔۔۔۔ نیا انسان بننے کے لئے ایک نظریے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مذہب ہمیں وہ نظریہ مہیا کرتا ہے۔ ٹھہرو مجھے بتاؤ۔ اب تمہارے پاس کیا ہے؟ وہ رکے تاسف و احساس جرم اور پشیمانی؟ اس اثاثے کی بل پر تم کیا کر سکتے ہو، کہاں تک جا سکتے ہو؟ اس بیماری کا مقابلہ کر سکتے ہو؟ تم اپنی گزشتہ زندگی کے متعلق سوچتے ہو اور اسے تلف کرنے کی فکر میں ہو حالانکہ یہ تمہارے بس سے باہر ہے۔ یہ جبھی ممکن ہے جو تم اپنا ذہن کو صافر کرو۔ تم یہ سب جانتے ہو اور مافوق الفطرت باتیں سوچتے ہو اور خطرناک حد تک تخیل پرست ہوتے جا رہے ہو۔ تم قطعی الاحاصل طور پر آہستہ آہستہ اپنے آپ کو ختم کر رہے ہو، اپنے وجود کو بے مصرف بنا رہے ہو، اپنے نئے اور دوسروں کے لئے اس وقت تمہیں ایک مثبت نظریے کی ضرورت ہے، ایسی قوت جو تمہیں اتنی تیزی سے آگے کی طرف چلائے کہ تمہاری پشیمانی اور احساس زیاں اور سارے غیر ضروری جذبات پیچھے رہ جائیں۔"(6) ڈاکٹر انصاری کے کردار کے حوالے سے فاضل مصنف اُداس نسلیں کے ہیرو نعیم کو مذہب کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہیں:

"رہبری کے لئے وہ ایک بے نظیر شے ہے۔ یا جیسے ایک عقلمند دوست مشورہ دیتا ہے۔ یا کیا اس کی جگہ اس سے بھی اہم ہے؟ اچھا رکو، پہلے یہ بتاؤ کہ مذہب کے بغیر ہم کیا نہیں کر سکتے؟ کھانا کھا سکتے ہیں، سو سکتے ہیں، ہل چلا سکتے ہیں، پھول اُگا سکتے ہیں، سفر کر سکتے ہیں، اور۔۔۔۔۔۔ یہ تو بکواس ہے۔ اچھا تو لو، مذہب کے بغیر بارش بھی ہوتی ہے۔ سیلاب بھی آتے ہیں، وبا بھی پھیلتی ہے، یہ بھی فضول ہے۔ البتہ شادی نہیں کر سکتے۔ مردے کو نہیں دفنا سکتے اور کچھ بھی ہو بھائی کچھ بھی ہو، دو باتیں تو نہیں ہو سکتیں۔ ایک ساتھ تو بہر حال نہیں ہو سکتیں۔ یعنی ایک بات سچ ہے اور جھوٹ بھی، یہ تو قطعی ناممکن ہے۔ یا آپ خدا پرست ہو سکتے ہیں یا دہریے ہو سکتے ہیں یا گنوار ہو سکتے ہیں پر سب ایک ساتھ تو نہیں ہو سکتے۔ ایک بات سچ ہے اور دوسری جھوٹ، صفا جھوٹ، لیکن سچ، سچ کیا ہے؟ کچھ تو ہے جس کا پتہ نہیں چلتا، کچھ کچھ نہ کچھ! لعنت ہے کیوں میں نے اتنی دیر تلک احمقوں کی طرح سوچا ہی نہیں؟ کبھی سوچ ہی نہیں آئی، حد ہے بھئی، کیسے کیسے نالائق لوگ بھرے پڑے ہیں دنیا میں یعنی سچ کو جاننے کے لیے لوگوں نے عمریں گنوا دیں۔" (7)

"سخت افسوس کی بات ہے۔ اب مجھے اور ڈاکٹر کو ہی لے لیجئے۔ مجھے روحانیت کی کوئی سوجھ بوجھ ہی نہیں اور وہ ہوا کٹر مذہبی آدمی۔ ہم دونوں کا اسلوب خیال، نقطہ نظر اور زندگی بسر کرنے کا نمونہ اور ایک دوسرے سے قطعی مختلف اور ہم کیسی شائستگی اور اطمینان سے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات قائم کئے رہے۔ بظاہر ایک ہی سمت میں بڑھتے رہے، صحت اور کامیابی کی طرف، ایک دوسرے کی روحانی زندگی جاننے کی ضرورت ہی محسوس ہوئی سوائے آج کے۔ تو۔۔۔۔۔۔ وہ کیا ہے جو اس مخالفانہ رویے کے باوجود محض دو انسانوں کی حیثیت میں ہمیں ایک دوسرے کا اعتماد حاصل کرنے کی توفیق دیتا ہے۔ جو ہمیں محض سوجھ بوجھ کی بناء پر یہ سمجھنے کی طاقت دیتا ہے کہ یہ دوسرا شخص بھی اتنا ہی سادہ دل اور محبت اور دوستی کا اہل ہے جتنے کہ ہم ہیں۔ کیا یہ خدا ہے؟ نعیم کے ذہن اور دل میں مذہب نے جگہ بنالی ہے۔" (8)

"باوجود ان سب چیزوں کے لیکن سچ کی تلاش میں جو وقت ہم ضائع کرتے ہیں جو قوت اور دلچسپی ہم کھوتے ہیں اس کے بدلے میں کیا ملتا ہے؟ آج اگر میں مان لوں کہ کائنات کے تمام ظواہر کو چلانے والی ایک برتر ہستی ہے جو سب کی خالق بھی ہے تو کیا فرق پڑے گا؟ یہ بھی مان لیا کہ مذہب ہی ایک رستہ ہے جس کے ذریعے ہم اس ہستی کو محسوس اور تسلیم کرتے ہیں، پھر؟ پھر کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔ میں اسی طرح لیٹا ہوا ہوں اور ایک مکھی مجھے تنگ کر رہی ہے۔ ابھی عذرا آئے گی اور پاس بیٹھ کر محبت سے مجھے دیکھے گی یا کتاب پڑھنے لگے گی اور مجھے جانے کیوں ندامت سی ہوگی۔ اور ڈاکٹر ہر روز آئے گا اور اس وقت تک جب تک کہ پھر باتیں کرنے کی خواہش اس پر غلبہ نہیں پالیتی دوا دے کر چلا جایا کرے گا اور اس کا نظریہ اور میرا نظریہ کہیں بیچ میں نہ آئے گا۔ میں ہل بھی نہیں سکتا میں یوکلپٹس کی پتوں کی اس بو سے بھی نجات حاصل نہیں کر سکتا جس سے میں تنگ آچکا ہوں۔" (9)

دوسرے ضخیم ناول باگھ میں سے مذہب کے حوالے سے عبد اللہ کا نظریہ دیکھئے: ذوالفقار چند لمحوں تک گہری نظروں سے اُسے دیکھتا پھر بولا: "تم خدا اور رسول پر یقین رکھتے ہو؟" اسد نے "ہاں" کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ بند کر لیا۔ وہ ان سوالوں کو ایسی سہل پسندی سے حل کرنے کا خواہاں نہ تھا۔ "ایک بار پہلے بھی آپ نے پوچھا تھا۔" اس نے کہا۔ "ہاں۔ دوبارہ اس لیے پوچھ

رہا ہوں کہ خدا اور اس کا رسول ؐ انسانوں کو انصاف اور آزادی کا حق عطا کرتے ہیں۔"، "خدا اور رسول پر تو وہ لوگ بھی یقین رکھتے ہیں جن کا ذکر آپ نے کیا ہے۔"، "ہاں۔ مگر اُن کی اور تمہاری سطح میں بہت فرق ہے۔ تمہارے دل میں انصاف اور آزادی کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ ایک فطری عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے۔ صرف یہ جذبہ رکھنے والے لوگ ہی نوع انسانی کی صحیح معنوں میں خدمت کر سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے، اس کے بعد مفاد بھی کسی حد تک مد نظر رہتا ہے۔"[10] قرآنی آیت کا حوالہ ملاحظہ کیجئے۔ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّ حَصِيْدٌ۔ "یہ تھوڑے احوال ہیں ہستیوں کے کہ ہم سُناتے ہیں تجھ کو کوئی ان میں قائم ہے اور کوئی کٹ گیا۔"[11] مسلمانوں کی عبادت گاہ مسجد اُنکے مذہب میں خاص اہمیت کو معاشرتی سطح کو اُجاگر کر دانتے ہوئے عبد اللہ حسین لکھتے ہیں۔ دیہاتی مساجد کا ایک اپنا خاص ماحول ہوتا ہے جہاں مسجد کے دروازے بطور سرائے بھی دن رات مسافروں کو پناہ دینے کے لیے کھلے رہتے تھے آج کے روز کی ہنگام زندگی میں مسجدوں کو بھی تالا لگائے بغیر گزارا نہیں ہے۔

اس وجہ سے سے دروازہ بہترین تھا۔ بات یہ تھی کہ دروازہ کبھی بند نہ ہوتا تھا۔ رات کے وقت جب سارے گھروں اور دکانوں کے دروازے بند ہو جاتے تو اس وقت بھی یہ دروازہ چوپٹ رہتا تھا۔ اندر بلب کی تیز روشنی مسجد کی دیواروں پہ پڑتی تھی۔ اور رات چاہے کتنی ہو جائے کوئی نہ کوئی ننگے پاؤں دھوتی اُڑسے کنویں سے پانی کے بوکے نکال نکال کر ٹنکی میں ڈال رہا ہوتا تھا اور ہر کوئی اندر جا کر غسل خانے میں نہا سکتا تھا۔ نماز پڑھنے کی پابندی نہ بھی۔ زیادہ تر لوگ خاص طور پر گرمیوں میں صرف نہانے کے لیے وہاں جاتے تھے اور نہا کر بھیگے بدن چپلی پہنے سیڑھیاں اتر کر گھر چلے جاتے تھے۔ سوائے جمعے کے دن کے جب محلے کے چھوٹے بڑے اپنے اپنے گھروں سے صاف کپڑے پہن کر مسجد میں جاتے تھے۔ اور کئی ایک وہاں پر دوبارہ وضو کرتے تھے۔ پھر سردی ہو تو صحن کے بیچ دھوپ میں اور گرمیوں کے دنوں میں بر آمدے کے تلے سائے میں گھس کر بیٹھنے کی کوشش کرتے اور منہ اُٹھا کر خطبہ سنتے تھے۔ مسجد سب کو پناہ اور امان دینے کی جگہ تھی جہاں ہر وقت زندگی متحرک رہتی تھی۔ مساجد میں درس اور قرآنی تدریس کے ماحول اور مولوی صاحب کا نقشہ عبد اللہ حسین نے خوب کھینچا ہے۔ اور اپنے بچپن کی یادداشتوں کو من و عن بیان کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ مذہب کی تبلیغ کرنے والے عیسائیت میں پادری، یہودیت میں فادر اور اسلام میں مولوی کہلاتے ہیں مولوی صاحب کی اہمیت اُنکے انداز و اطوار کا نقشہ فاضل مصنف نے خوب کھینچا ہے: "میاں کی شکل اُس وقت مولوی جی کی شکل کی سی تھی۔ بڑی سی ڈھیلے بلوں والی سفید پگڑی اور سفید داڑھی اور پستہ قد، گندھا ہوا، بھاریُ جثہ اور نیلا کرتہ نیلا تہمد اور میاں کا ایک ڈنڈا تھا۔ میں اور مانو اور سادو اور کریما اور تندور والی لڑکی اور سجو اُن دنوں ظہیر کی نماز کے بعد مولوی جی سے قرآن شریف پڑھنے جایا کرتے تھے اور کئی اور بچے دوسری گلیوں سے بھی آتے تھے۔ پہلے کوئی درویش کچھ درس دیتا تھا جب کہ سارے بچے ایک ایک کر کے آتے جاتے تھے۔ پھر مولوی جی حجرے کے دروازے پہ آکر اندر آنے کا اشارہ کرتے تو ہم سب اُٹھ کر حجرے کے اندر چٹائی پر جا کر بیٹھتے تھے۔ چٹائی پر ایک چوکور گدا مولوی جی کے بیٹھنے کے لیے تھا اور پیچھے ایک گاؤ تکیہ تھا۔ تکیے کے اوپر دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ جہاں سے بس اتنی روشنی پڑتی تھی کہ مشکل سے حرف نظر آتے تھے اور دروازہ اندر سے بند کر لینے پر حجرہ اور بھی تاریک ہو جاتا تھا۔ پھر پچھلے سبق میں یا اگلے میں جو کوئی اٹکنے لگتا تھا اُس کو مولوی کی نیچی مگر رعب دار ڈانٹ کی آواز پڑتی تھی۔۔۔۔ "میاں کا ڈنڈا!۔۔۔۔" اور زبان بندی کی اس آواز پر اٹکنے والا اپنی جگہ چھوڑ کر مولوی صاحب کے پاس جا بیٹھا تھا۔ وہ اُس وقت تک وہاں چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا جب تک کہ کسی دوسرے اٹکنے والے کو آواز نہ پڑ جاتی تھی۔"[12] "مسجد کے دروازے پر چار پانچ سپاہی لاٹھیاں اُٹھائے کھڑے تھے اور دروازے میں مولوی سردار شاہ پہاڑ سا سینہ نکلا دونوں بازو پھیلائے اُن کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ ہجوم سے گھبرا کر سپاہیوں نے اندر گھسنے والے کو

ایک ڈنڈا کو ایک ہلا کر مارا تو مولوی جی سو سال کے بوڑھے درخت کی مانند دروازے میں جمے کھڑے رہے جیسے کہ ریل گاڑی کا انجن بھی انہیں اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔ "مُرقد کو ختم کرنے والا" وہ گرجنے لگے، دین کا سپاہی ہے اور اللہ کے گھر کا پناہ گیر ہے۔" اُن کے عقب میں صرف ایک درویش نظر آرہے تھے مگر پتا چلتا تھا کہ مسجد کے اندر کوئی اور بھی ہے جو اُن کی حفاظت میں ہے۔ دور دور کی گلیوں کے آدمی جو وہاں جمع ہو رہے تھے اور سب مولوی جی کے طرف دار تھے۔ "شاہ جی دروازہ بند کرو۔" کسی نے آواز دے کر کہا۔ "یہ اللہ کی آنکھ ہے، دروازہ نہیں۔" مولوی جی گرجے۔ اللہ کی آنکھ بند نہیں ہوتی۔ دست انداز خادم کی لاش سے گزر کر جائے گا۔" اپنے کوٹھے پر کھڑے کھڑے یہ نظارہ دیکھتے ہوئے جب اس کی گرج کی آواز میرے کان میں پڑی آناً فاناً مجھے پتا چل گیا کہ دروازہ کیوں اتنا روشن اور پرکشش تھا۔ یہ اللہ کی آنکھ تھی۔"(13)

"قید" میں سے مذہب کی مثالیں

"قید" میں عبداللہ حسین نے مذہب میں نت نئی اختراعات اور ناسمجھ عوام کی شرک پرستی کو کس فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے:
"احمد شاہ کی پریشانی اب برہمی کی حالت کو پہنچ چکی تھی۔ اُسے موقع ملا تو بولا۔ "یہ کیسی بک بک لگا رکھی ہے۔ ایسی لچر باتوں کو دُہرا کر بخشش مانگتی ہو؟ اپنی آخرت تباہ کر رہی ہو ساتھ میرا ایمان بھی خراب کرتی ہو۔ اگر کچھ بتانا ہی تو یہ بتا کہ تُو نے یہ اقدام کس واسطے کئے؟" "بخشش کا کسے علم ہے میاں جی، رضیہ سلطانہ بولی، وہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے صرف اپنے بدن سے اس زہر کو دُھونا چاہتی ہوں۔ اب آخری حال بیان کرنا رہ گیا ہے، وہ بھی سُن لیں۔ اس کے بعد میری جان آسانی سے نکلے گی۔ اللہ آپ کو اس کی جزا دے گا۔"(14) ملا کی بے عملی اور دورخی کو احمد شاہ کے کردار کے ذریعے بے نقاب کیا ہے مذہبی حوالوں کی کمی کو عبداللہ حُسین نے "قید" میں پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ "پیری مریدی" کے چکر میں عوام مذہبی ٹونے ٹوٹکوں کی اندھا دھند تقلید کرتے ہیں اور شرک کی حد تک مرشد اور پیر و سائیں کی پیروی و پُوجا کرتے نظر آتے ہیں۔ سماع کی کیفیت کو سمجھنے والے کب کے رُخصت ہو گئے لیکن مزاروں پر قوالیاں جاری ہیں۔ جس مذہب نے شرک کو ظلم اور خدا کا شریک ظالم قرار دیا ہے۔ بندے اُس رب کے بندوں کے پیروں کو ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہیں اُن کے آگے سر جھکا رہے اور متقی اور زاھدوں کا چولہ پہنے یہ ڈھونگی کاغذ کے پرزوں پر الفاظ لکھ کر عورتوں کو بیٹے اور مردوں کو مقدمے میں فتح لے کر دیتے نظر آتے ہیں۔ "قید" میں جب اپنا رقیہ پھانسی کی کوٹھڑی میں اپنا مقدمہ احمد شاہ کے سامنے لڑتی ہیں تو فاضل مصنف کی موضوع پر اور جملوں پر گرفت نظر آتی ہے: "احمد شاہ کے چہرے پہ بوکھلاہٹ کی جگہ اب سراسیمگی پھیل چکی تھی۔ اس کے آنکھوں میں ہراس کے نشان تھے۔ بات اُس کے منہ سے نہ نکلتی تھی۔ مگر کمال ہے اُس کا کہ اپنے آپ پہ قابو کر بولا "مسجد کی حرمت کے بارے میں خدا کے سخت احکام ہیں۔"۔ "حُرمت کے چوکیدار مولوی" رضیہ سلطانہ چلا کر بولی، چار گھنٹے کی معصوم جان خدا کے گھر کی بے حُرمتی کرے گی؟ خدا کا گھر اِتنا کچا ہے؟ سُن ہم غریب لوگ ہیں، مگر میں عالموں کے گھرانے کی اولاد ہوں۔ سُن تیرا خدا کیا کہتا ہے۔ سورۃ بقرہ کو یاد کر۔ یصور کم فی الارحام۔ میں ماؤں کے رحموں میں (بچے کی) تصویر بناتا ہوں۔ احمد شاہ تم اللہ کی بنائی تصویر کو پتھروں سے پاش پاش کرتے ہو اور پاکدامنی کے دعویدار بنتے ہو؟ یہ حق تجھے کس نے دیا ہے؟ تم دوسروں کے گناہوں کا حساب چُکاتے ہو؟ پھر سورۃ بقرہ کو یاد کر وتِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۔ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ ۔ وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡ ملے گا۔ جو تم کسی شے کے ٹھکیدار نہیں ہو۔ بے حرمتی کی بات کرتے ہو؟ رسول کی حدیث یاد کرو۔ فرماتے ہیں بچے کو چپت مارو اور فرماتے ہیں غلاف کعبہ کی بے حرمتی سے زیادہ مجھے انسان کے بے حرمتی کا دُکھ ہو گا۔ ہائے تم نے میرے ہاتھوں سے بے گناہوں کا خون کرایا۔ جب تیسرا پتھر میرے بچے پہ گرا تو میں غش کھا گئی۔"(15)

سیاست اور مذہب کے ملاپ کی تصویر کشی عبداللہ حسین نے خوب انداز میں کی ہے:"فوجی آمروں کے دور میں بھی فوج، خانقاہی نظام، اور سیاسی نظام کی مثبت کوچوں کاتوں قائم رکھا جاتا ہے۔ کرامت علی کا کردار جوانی میں سیاست میں طالع آزمائی کرتا ہے جب بات نہیں بن پاتی تو افسر شاہی سے سفر کرتا پیری مریدی کی جانب ملتفت ہو جاتا ہے اُس کا جانشین سلامت علی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کے لئے مذہبی استحصال کا استعارہ بن کر سیاسی قوت کی آڑ میں سامنے آتا ہے جو خانقاہی کا تاج پہن کر مذہب کی آغوش میں چھُپ کر باپ کے خواب کو لے کر آگے بڑھتا ہے:"ص۔ص:(کمیونسٹ کا فلسفہ) تو دہریہ خیالات کی بنیاد پر ہے۔ مگر ان کی پارٹی کی تنظیم لاجواب ہے۔ ہمیں بُرے لوگوں کی اچھی باتیں اپنانے میں عار نہیں ہونی چاہیے۔ ب(ر): بالکل نہیں سر۔ اس ضمن میں تو ایک حدیث بھی موجود ہے۔ص۔ص:(بات کاٹ کر): ہمارے کلچر کے مقابلے میں دنیا کا انفراسٹر کچر ہزاروں سال پُرانا ہے۔ اسے قائم رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض اولین ہے۔ ب(ر)(جوش سے): بالکل سر ہمارے کلچر کے مقابلے میں دنیا کا کوئی کلچر نہیں ٹھہر سکتا سب دوسرے کلچر بُتوں کے فرامودہ ہیں۔ ہمارا کلچر اللہ تعالیٰ کا بخشا ہوا ہے۔"(16)

اس پیورو جمہوریت میں جمہور یعنی عوام اور بیورو کریٹس جاگیردار اور اعلیٰ ادارے سب پیروں کے لئے مؤثر ہتھیار ہیں جن کی مدد سے وہ اپنا لوہا اقتدار کے اونچے ایوانوں میں منوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔""قید"میں سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:"ایک زمانہ پھر آیا کہ جرنیلوں کی حکومت قائم ہوگئی جس طرح سیاستدانوں نے اسلام اور توحید کے نام پر قوم کو یکجا رکھنے کی کوشش کی تھی جب جرنیل سیاست پر قابض ہوئے تو انھوں نے بھی یہ بنا بنایا حربہ مستعار لے لیا۔ ملک کی مسلح افواج نے ایک ایسا پلٹا کھایا کہ ان کی انگریزیت دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگئی جہاں وہ پہلے صرف انگریزی بولتے اور کلبوں میں پی پلا کر چاہتے تھے اب یکایک انھی افسروں نے نمازیں پڑھنی اور حج و عمرہ کے فریضے ادا کرنے شروع کر دیئے تھے جیسے کہ چند ہی روز میں انھوں نے اللہ کے دین کو دریافت کر لیا ہو۔ صدر مملکت پیر پرست جرنیل تھے ان کی دیکھا دیکھی فوج کے سینئر افسران نے بھی مرشد پکڑنا شروع کر دیئے۔ اس زمانے میں کرامت علی شاہ کی مرشدی خوب چمکی۔"(17) پیش کردہ اقتباس عبداللہ حسین کے وسیع مشاہدات کی خوبصورت مثال ہے انہوں نے سادہ اور چھوٹے جملوں کی مدد سے پاکستان کے سیاسی اُفق پر چھائی مذہبی لہر کی نشان دہی کر کے معنویت کو دوآتشہ کر دیا ہے اور اسلوب کے داخلی اور ظاہری مظاہر کو پوری صحت سے سامنے لائے ہیں۔ اُن کی نظروں سے ملکی سیاست نام نہاد اسلام پرستوں کی کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے افکار کو بہت بہتر انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ عبداللہ حسین نے بڑے خوبصورت اور احسن طریقے سے اپنے ہیروز نعیم۔ اسد اور اعجاز کے ذریعے ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹۷۶ء کے تمام اہم واقعات کو اپنے ناولوں کا حصہ بنایا ہے۔"اُداس نسلیں"میں ناول کے آغاز سے پہلے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا عظیم واقعہ رونما ہو چکا تھا اور اُدھیڑ عمر اور نوجوان مسلم نسل اپنی بقاء کے لئے مقدور بھر کوشش کر رہی تھی انہوں نے علامتی طور پر ایک گاؤں"روشن پور"کے ذریعے برصغیر کا رہن سہن ہم تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ان سے پہلے کسی ناول نگار نے سیاسی حالات و واقعات کو اس انداز سے ادب کا حصہ نہیں بنایا ہے۔ عبدالحلیم شرر، نسیم حجازی، اور قراۃ العین حیدر جیسے ناول نگار سیاسی واقعات مبالغہ آمیز اور فینٹیسی کی صورت میں ہمارے سامنے لائے ہیں لیکن عبداللہ حسین نے سیاسی اور تاریخی واقعات کو جوں کا توں اور حقیقت پسندانہ انداز میں میں فکشن کا حصہ بنایا ہے۔ اس جُرم کی سزا کے طور پر اُن پر کئی طرح کے الزام لگائے گئے۔ عبداللہ حسین کے ناولوں کا جب ہم اسلوبیاتی جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں تو اس میں سب سے اہم یہ مسئلہ درپیش آرہا ہے کہ جب اُن کے فن پاروں میں صفحات کے صفحات تاریخی، سیاسی اور مذہبی حوالوں سے بھرے ہوئے ہیں تو مقالہ نگار اُن کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے۔ اُن کی نگارشات کا سب سے اہم حصہ اگر نازک خیالی، شعریت یا جمالیاتی حیات کے

معیار پر پورا نہ بھی اُترے تو بھی ہم اُن سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر ان پر تفصیلاً نظر ڈالی جائے جو ناگزیر ہے تو اسے اسلوبیاتی بے قاعدگی کہہ کر رد کیا جا سکتا ہے میرے پیشرو محترم ڈاکٹر عامر سہیل سہیل بھی اس مسئلے سے دوچار وہ لکھتے ہیں: "میرے خیال میں یہ نزاعی مسئلہ اس وقت شدت اختیار کر لیتا ہے جب ہم تخلیقی اُسلوب کو صرف نازک خیالی شعریت، لطافت، جمالیاتی احساس، رنگین بیانی، سلاست، نغمگی، شگفتگی، تخیل، جذباتیت، رومانیت، تاثیر، لفاظیت اور روانی تک تک محدود کر لیتے ہیں اور لکھنے والے سے یہ توقع باندھ لیتے ہیں کہ وہ ہماری فرض کردہ توقعات پر پورا اُترے جب وہ ہماری طے کردہ شرائط پر ٹھیک ٹھیک چلتا ہے تو ہم اُس پر "اچھے اور معیاری اسلوب" کا لیبل لگا دیتے ہیں اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو جائے تو اُسے "ناہموار اسلوب" کہہ کر بات ختم کر دی جاتی ہے۔"[18] مزید فرماتے ہیں: "ذاتی پسند و ناپسند کا معاملہ اپنی جگہ اہم ہو سکتا ہے لیکن یہ اُسلوب اور اسلوبیات کا انتہائی محدود تصور ہے یہ تصور اس لیے محدود ہے کہ اس میں اسلوبیات کے تمام معاملات کو ہم اپنی شرائط پر حل کرنا چاہتے ہیں اور یہ باور کرنے کی کے لیے بالکل تیار نہیں ہوئے کہ تخلیق کار کی اپنی آزادی بھی اہم ہوا کرتی ہے ایک تخلیق کار اپنے تخلیقی جبریت کے زیر اثر کن کیفیات اور واردات سے گزرتا ہے اس کا اندازہ نقاد نہیں لگا سکتے۔"[19] تخلیق کار اپنی ذات کے علاوہ اپنے اردگرد کے ماحول کا گہرا اثر قبول کرتا ہے۔ عبداللہ کا مقصد چاہے وہ اس حقیقت کو قبول کرنا چاہے یا نہیں سیاسی و تاریخی واقعات کو سچائی کے ساتھ ہم عصر نسل کے ساتھ ساتھ اگلی نسلوں تک پہنچانا ہے۔

سیاست عبداللہ حسین کا پسندیدہ موضوع ہے اُنکی سیاسی بصیرت کو داد دینا ناانصافی ہوگی ہماری حکومت ہمارے لیڈر ہمارے سیاست، ہماری اسٹیبلشمنٹ ہمارے نیوٹرل ہمارا طبقہ اشرافیہ کیا آج بھی اُسی مدار میں نہیں گھوم رہا ہے جس پنڈولم پر جھومتے اور ڈگڈگی بجا کر بندر کی طرح عوام کو نچاتے عبداللہ حسین نے "اُداس نسلیں"، "باگھ" اور "نادار لوگ" میں دکھایا ہے۔ اُنھیں برصغیر کی سیاست کی بالعموم اور پاکستانی سیاست کی بالخصوص باریک بینوں اور چالوں کا گہرا شعور حاصل تھا۔ آج بھی ہمارے نوجوان نعیم کی طرح دکھتے ہیں۔ آج بھی ہمارا ہر سیاستدان جب چاہے اور جس انداز میں چاہے مذہبی کارڈ کھیل کر عوام کے جذبات سے کھیلتا ہے:

> "اور یہ پوچھتے اس کی بھاری بخار زدہ آواز سے نعیم کو اندازہ ہوا کہ وہ واقعی بہت زیادہ تھک چکا تھا۔ اس نے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ پھرتے ہیں کہ آخر ہم کتنے آقاؤں کے غلام ہیں؟
> تمہیں پتہ ہے کہ ہم کیوں لڑ رہے ہیں؟ اچانک مہندر سنگھ نے پوچھا۔
> "جرمنوں نے حملہ کیا ہے۔"
> "کہاں؟ روشن پور پر؟"
> "یہاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"
> پر ہم یہاں کیوں ہیں "ہم کس لئے آئے؟"
> "جرمن انگریزوں کے دشمن ہیں اور انگریز ہمارے مالک ہیں بس۔"
> "ہمارے مالک روشن آغا ہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں۔"
> "انگریز روشن آغا کے ممالک ہیں۔ چنانچہ"
> "کل کتنے مالک ہیں۔ ایک دفعہ بتاؤ۔" وہ ایک دم چڑ کر بولا۔ نعیم کے گلے میں کوئی چیز آکر اٹک گئی۔ اُس نے سگریٹ کا کش لیا اور فوراً دھواں اُگل دیا۔"[20]

کسی بھی لکھاری کا اُسلوب جب اُسکے متنی تناظرات میں جانچا جائے تو متن میں موجود عبارت کے معنیاتی دائروں میں وسعت پیدا ہوگی اور افکار و معنی کے نئے دروا ہوں گے۔ ہندوستان کے جوان اپنے سسکتے ماضی اور بکتے حال سے باخبر ہیں۔ کہیں عبد اللہ حسین ہماری آج کی نسل کی بات تو نہیں کر رہے ہیں جس کو وہ اپنے قارئین کی تیسری نسل قرار دیتے ہیں: "اوہ۔۔۔۔۔۔مدن تعلیم کے ماتھے پر ہاتھ مارے ان لوگوں سے بچ کر تم کہاں جاسکتے ہو اس جنگ میں سبھی شریک ہیں۔ ہندوستان کتنا بڑا ملک ہے۔ اس میں کتنے جاگیر دار کتنے مالک اور کتنے نوکر ہیں۔ اس کا تمہیں کوئی اندازہ نہیں ہم چند آدمی غاروں میں چھپ کر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ راندوں کی زندگی اور رندوں کی جنگ ہے ہم اپنے والدین کی نسبت بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں انہوں نے محنت کی اور خاموش رہتے بڑی خاموش، بڑی طاقت ور جنگ، ہم نہ محنت کرتے ہیں نہ جنگ کرتے ہیں محض چوری کرتے ہیں۔"(21)

عبد اللہ حسین کے ناول اپنے سیاسی ماحول اور سیاسی پس منظر کے حوالے سے قارئین کو کرب میں مبتلا کر دیتے ہیں کیونکہ اُن کے کردار اضطراب بے چینی اور کرب میں مبتلا ہیں۔ وہ کارل مارکس اور ترقی پسندوں سے متاثر تھے اسی لئے اُن کی تحریروں میں ادب برائے زندگی واضح طور پر نظر آتا ہے وہ بے جارومانیت کے قائل نہ تھے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کی ہم تحاریک اور اہم رہنماؤں کا ذکر عبد اللہ حسین کرتے ہیں تو باوجود اختصار کے اُن تمام شخصیات، واقعات اور تحاریک کا نقشہ قاری کے سامنے کھینچ جاتا ہے۔ مثلاً اُداس نسلیں، میں مٹر گوکھلے، محمد علی جوہر، ڈاکٹر اینی بیسنٹ، مہاراج کمار پرتاب گڑھ، مسٹر تلک گاندھی جی، محمد علی جناح، جواہر لال نہرو، سر آغا خاں، مولانا حسین مدنی، مسٹر شفیع، محمد علی جوہر، شوکت علی، موتی لال، ملکہ وکٹوریہ کا ذکر کرتے ہیں۔ انگریز حکومت کے دوران ہونے والے سانحات جن میں جلیانوالہ باغ، قصہ خوانی بازار کا واقعہ اہم ہیں ہجرت کی داستان غم عبد اللہ حسین نے نہایت پُر انداز میں اختصار کے ساتھ پیش کی ہے۔ سیاسی راہ نما کے حوالے سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> "میں جانتا ہوں یہ تمہارا اگرو ہے گاندھی وہ مسکرایا۔ گاندھی راہب، سادھو، ولی اللہ جو ہوا میں باتیں کرتا ہے۔ اس کا حلیہ تم نے کبھی دیکھا ہے اور تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں مسلک لے کر رہنے والا ہے وہ کبھی گورنر کی دعوت میں نہیں گیا۔ اُس کی تقریریں اور فلسفے تمہاری کیا مدد کریں گے؟ جنوبی افریقہ میں اس نے کیا کیا، جانتے ہو؟ وہ خاموش ہو گیا اس کے ماتھے کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی وہ مانوس رگ جو خطرے یا جوش کے وقت ظاہر ہوتی اُبھر آئی۔"(22)

اُداس نسلیں کے موضوع کے متعلق قمر رئیس اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اداس نسلیں پہلا ناول ہے جس میں پہلی جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ہند تک برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں، تحریک آزادی کے مرحلوں اور تحریک میں کسان، مزدور طبقہ کے حصہ اور حیثیت کو پنجاب کے نقطہ نگاہ سے دیکھا اور پیش کیا گیا ہے۔"(23) "باگھ میں جبر کی صورتیں اور آزادی کی اہمیت علامتی پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں معاشرتی حقائق، ریاستی جبر اور نفسیاتی ژرف بینی دکھائی گئی ہے اس ناول کی کہانی ایک رُخی اور سیدھی ہے اس میں ادبی شان پیدا کرنے کے لئے عبد اللہ حسین نے کئی اُستادی حربے استعمال کئے ہیں لیکن بے واقعات، ضرورت سے زیادہ سسپنس، اور سیدھا سادا بیانیہ اس کی تخلیقیت کی شان بڑھانے کی بجائے کم کرتا ہے۔ سیاسی واقعات اور ریاستی بالادستی کے بھرپور واقعات "باگھ" کے قاری کو حیران کر دیتے ہیں: "تمہیں علم ہے یہ علاقہ اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہا ہے۔ ان حالات میں کسی بھی چھوٹی سی چھوٹی بدامنی کا رسک بھی نہیں لیا جاسکتا۔ یہ قوم اِس وقت جس مرحلے پر ہے اُس کو اگر ہم نے کامیابی سے سر کرنا ہے تو اتھارٹیز کا مکمل کنٹرول اس کے لئے پہلی شرط ہے۔" "اتھارٹیز!" اسد نے اچھنبے سے دہرایا، قوموں کے مرحلے کیسے سر سکتی ہیں؟"(24) کشمیر جیسے نازک موضوع پر قلم اُٹھاتے وقت شاید عبد اللہ حسین کے پاس کشمیر کاز اور کشمیر گوریلا جنگ کے بارے میں ضروری معلومات کا فقدان ہے جس کی وجہ سے اصل موضوع اور مسائل

ابہام اور دھندلاہٹ کے پردے میں چھپے رہے لیکن پاکستان کی ڈوریں ہلانے والی خود کو ظاہر نہ کرنے والی طاقتوں کو اُنھوں نے خود کو سنسر شپ کی تلوار سے بچاتے بچاتے بھی خاصا بے نقاب کیا ہے: "ذوالفقار کے چہرے پر ہلکی سی، پُر اعتماد مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔ پراپیگنڈا، میرے دوست، جو تمہیں اخباروں اور کتابوں میں ملتا ہے، یہ سیاست کے مرحلے طے کرتا ہے نہ جنگ کے قوم جمہوریت۔ انقلاب یہ سب کیا ہے؟ اُس کا ہاتھ ایک لحظے کے لئے ہوا میں اُٹھا اور ایک ہلکے سے دھماکے کے ساتھ میز پر آرہا۔ "ایکشن" وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "ایک ہزار کتابیں لکھی جاتی ہیں تو ایک دور عمل آتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے انقلابوں میں لاکھوں آدمیوں کو، انقلاب کے سپاہیوں کو مراد دینا ضروری سمجھا گیا۔ کیوں؟ ڈسپلن۔ تمہیں علم ہے اس وقت بڑی بڑی نامور انقلابی حکومتوں کو کون چلا رہا ہے؟"

"اُس نے اعلانیہ انداز میں انگلی ہوا میں اٹھائی، ملٹری"

ذوالفقار کی آنکھوں کی پوشیدہ آگ چمک اُٹھی تھی۔"(25)

سیاسی حوالے دیتے وقت اور ناول کے اختتام پر عبداللہ حسین زمانی مدت صحیح طریقے سے بیان نہیں کر پائے "اسد" کی بے یقینی کی کیفیت کو پیش کرنے کے لئے فاضل مصنف نے شعور کی رو کی تکنیک کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ فوجی آمروں کے ہاتھوں کچلے جانے والے گمنام حریت پسندوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ تم آزاد بھی ہوں اور قید بھی تمہاری واپسی کا بندوبست ہو جائے گا۔ "پھر موقع ملے، پھر چلے جاؤ۔ پنجاب کا چکر لگانا چاہو تو جا کر لگا آؤ۔ کسی پوائنٹ پر پہنچ کر فرض کیا کہ فارغ ہونا چاہتے ہو تو اس کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی اس کام میں ہر آدمی کا میکسیم یوٹلائزیشن پوائنٹ ہوتا ہے۔ ایسی کوئی پرابلم نہیں۔ مگر ایک بات میں تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں، کہ یہ ایک ٹرسٹ ہے کوئی سروس وغیرہ نہیں اس میں رضامندی اور کومٹ منٹ اشد ضروری ہے۔ تم جو کوئی قدم اٹھاؤ، سوچ سمجھ کر اٹھاؤ، کسی دباؤ یا لالچ میں آکر مت اُٹھاؤ۔(26) نادار لوگ میں ایک خاص وقت میں خاص خطے کے سیاسی حالات کا خوبصورت عکس پیش کیا گیا ہے۔ "نادار لوگ" کی کہانی بہت طویل اور گھمبیر ہے لیکن اس چھتنار ناول میں ۱۸۹۷ء سے ۱۹۷۴ء تک کے اہم ملکی حالات و واقعات کے علاوہ کئی ذیلی موضوعات بھی سامنے آتے ہیں۔ فسادات، دو قومی نظریہ، ملکی وسائل اور انتظامات کی بدعنوانیاں، تقسیم کے بعد مسلم سکھ معاشرے کا باہمی بھائی چارہ مزدور یونین، بھٹہ مزدوروں کی نسل در نسل غلامی اور نئی نسل کی خواہش انقلاب جیسے موضوعات سے مصنف نے پوری طرح انصاف کیا ہے ایک خاص سیاسی پارٹی کا عروج اور عوامی ذہن میں اسکا نفوذ نچلے طبقے کا استحصال، صحافتی اقدار کا زوال اور زرد اور لفافہ صحافت کی شروعات، سیاستدانوں کا حاکمانہ اور منافقانہ رویہ بڑے معنی خیز طریقے سے بیان کیا ہے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کا حوالہ دینا بھی عبداللہ حسین جیسے نڈر مصنف کا کام ہے۔ "نادار لوگ" میں مصنف نے خوبی کے ساتھ مکالمے پر انحصار کیا ہے: "دو ہاتھ ٹبر سے نکل جائیں تو ہمارا ٹھیکہ پورا نہیں ہوتا۔ ٹھیک ایک ہزار رنگ روز کے مانگتا ہے کہتا ہے ہماری پیشگی کی رقم زیادہ ہے۔ سکول کی ضد میں نے کی تھی وزن شادے پر آپڑا میں نے سوچا تھا کہ بچہ پڑھ لکھ جائے۔ اس پیشگی کی غلامی سے نکل جائے گا۔ جیسے اللہ کی مرضی۔"" اس کی پیشگی کی رقم سے ان کے سارے کنبے کی زندگی کا سودا طے پاتا ہے۔"(27) اس میں عبداللہ حسین نے خذف کی تکنیک کو سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ خذف کا سب سے خوبصورت استعمال ۱۹۷۱ء کی جنگ کے وقت ہوا جب مصنف سقوط ڈھاکہ کے دلخراش مناظر کی تفصیل میں جائے بغیر ہتھیار ڈالنے کے بعد قید ہونے والے نوے ہزار قیدیوں میں سے کیپٹن سرفراز کے پاس قارئین کو لے چلتے ہیں اور ان زخموں سے چور چور قیدیوں کے ذریعے ہم جنگ کی تباہ کاریوں سے واقف ہوتے ہیں۔ مثال ملاحظہ کیجئے:

"سٹیج کے پیچھے ہلچل مچی نعرے بلند ہوئے اور اچانک ڈائس پر ان کا لیڈر نمودار ہوا۔ وہی عام سا شلوار قمیض، پاؤں میں چپلی، قمیض کے کف کھلے۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے تالی بجائی پھر بازو کھول دیئے جیسے سارے جہاں کو خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ قمیض کی آستین ڈھلک گئیں اور کہنیوں تک بازو ننگے ہوگئے۔ ہجوم میں ایک غلغلہ بلند ہوا۔ نعرے بند ہوئے تو تالیاں بجنے لگیں ۔ تالیاں رُکیں تو پھر نعرے شروع ہوگئے کئی منٹ تک اسی طرح شور مچا رہا۔ پھر لیڈر نے ہاتھ اٹھا کر مجمعے کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا غل اس طور پر تھا جیسے ایک مہیب الجثہ جانور کے آخری دم نکلتے ہوں ہجوم آخری بار جھر جھر ایا اور خاموش ہو گیا۔"(28)

"جہانگیر کہتا ہے واہ واہ بڑے بھاری جلسے ہو رہے ہیں۔ مگر تمہیں پتا ہے کہ لوگ کیا دیکھنے جاتے ہیں؟ لوگ عورتوں کے ڈانس دیکھے جاتے ہیں جب ووٹ پڑیں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"(29)

دوسری جگہ بریگیڈیئر صاحب کو ان کی بیٹی اشرافیہ اور عوام کے میل ملاپ کو حیرت کے ساتھ بتاتی ہے۔ "سب سے پہلے تو یہ غریبوں کے حق میں ہیں دوسرے یہ لبرل لوگ ہیں سوسائٹی کی گھٹن کو دور کرنے والا ہیں آپ کبھی چل کر دیکھیں، ایسے ایسے حیرت ناک واقعات ہوتے ہیں، میں آپ کو بتاؤں، آج کے جلسے میں بڑے بڑے گھروں کی عورتیں اپنی اپنی مائیوں کے ساتھ جن کو وہ عام طور پر چھونا بھی پسند نہیں کرتیں، ہاتھ میں ہاتھ دے کر ناچ رہی تھیں اسی لیے تو لوگ آپ کے لیڈر کو شعبدہ باز کہتے ہیں۔"(30) عبد اللہ حسین کا سیاسی شعور اپنے زمانے سے بھی آگے کے حالات کی پیشین گوئی کرنے پر قادر تھا کیا اوپر دی گئی مثال جلسے کے بھاری ہونے کی واہ واہ عورتوں کا ڈانس 2023ء میں بسنے والوں کو اپنے ارد گرد نظر نہیں آ رہا ہے۔ عارف صدیق اس ناول کے سیاسی پہلوؤں کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں: "نادار لوگ" میں پاکستانی سماج کی جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ عبد اللہ حسین کو اُردو ادب کی صف اول کے ناول نگاروں میں لا کھڑا کرتی ہے۔ پولیس گردی اور جاگیرداروں کے ذریعے غریب عوام کو جس طرح ظلم و استحصال کا نشانہ بنایا جاتا ہے "نادار لوگ" کے کردار اس کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کا دولخت ہو جانا اور پھر اس کے سماج پر اثرات کا بھی بڑی باریک بینی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔

خلاصۂ بحث

مجموعی حوالے سے دیکھا جائے تو عبد اللہ حسین کی ناول نگاری کا نو آبادیات کے تجزیے سے شروع ہونے والا سلسلہ "نادار لوگ" تک پہنچتے پہنچتے نو آبادیاتی عہد کی سیاست سماج، اور کلچر کی بھرپور عکاسی کرتا چلا آ رہا ہے۔"(31) عبد اللہ کے ناول "قید" میں گدی نشین صاحبزادہ سلامت علی اپنی طاقت سیاسی اثر و رسوخ سے اور سابقہ کرنیلوں کی مدد سے بڑھانے کا آرزو مند ہے۔ لیکن مجموعی طور پر عبد اللہ حسین نے مذہب، سیاست اور تاریخ کے حوالے سے مسلمہ اور مُستند بات کی ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ وہ تخلیق کار ہونے کے ساتھ مؤرخ، محقق بھی ہیں اور اپنے مذہب کی بنیادی معلومات پر دسترس رکھتے ہیں۔

References

[1] Muhammad Asim Butt, *Swānih Hayat* (Islamabad: Academy, Adbiyāt Pakistan), 2018, 40.
[2] Abdullah Hussain, *Udās Naslain* (Lahore: Sang-e-Meal Publication, 2018), 202.
[3] Abdullah Hussain, *Udās Naslain,* 202.
[4] Abdullah Hussain, *Udās Naslain,* 202.

[5] Abdullah Hussain, *Udās Naslain,* 374
[6] Abdullah Hussain, *Udās Naslain,* 375
[7] Abdullah Hussain, *Udās Naslain,* 377
[8] Abdullah Hussain, *Udās Naslain,* 377/378
[9] Abdullah Hussain, *Udās Naslain,* P 390
[10] Abdullah Hussain, *Bagh* (Lahore: Sang-e-Meal Publication, 1981), 215.
[11] Abdullah Hussain, *Bagh* 217
[12] Abdullah Hussain, *Bagh* 219
[13] Abdullah Hussain, *Bagh* 221
[14] Abdullah Hussain, *Qaid* (Lahore: Sang-e-Meal Publication, 2018), 96.
[15] Abdullah Hussain, *Qaid,* 96.
[16] Abdullah Hussain, *Qaid,* 98
[17] Abdullah Hussain, *Qaid,* P 99
[18] Amir Sohail, Jadid Lisānyāti aur UslobyātīTaswurāt (Faisalabad: Mishal Publication, 2021), 243.
[19] Sohail, Jadid Lisānyāti aur UslobyātīTaswurāt 243
[20] Abdullah Hussain, *Udās Naslain,* 401
[21] Abdullah Hussain, *Udās Naslain,* 402
[22] Abdullah Hussain, *Udās Naslain,* 403
[23] Muhammad Younis Malik, *Udas Naslain Kā Siāsī pas Manzar* (Islamabad: Mushmolah adbyat, Sahmahi, Acadmi, Adbeyat , 2018), 437
[24] Abdullah Hussain, *Bagh*, 182.
[25] Abdullah Hussain, *Bagh*, 182
[26] Abdullah Hussain, *Bagh*, 184
[27] Abdullah Hussain, *Nadar Log* (Lahore, Sang-e- Meal Publication, 2004), 148.
[28] Abdullah Hussain, *Nadar Log* ,427
[29] Abdullah Hussain, *Nadar Log* ,380
[30] Abdullah Hussain, *Nadar Log* ,P 400
[31] Arif Saddiq, Abdullah Hussain kay Navloon ka tanqide Mutāla, Noabadyat say Pas Noabadyat tak, M Phil thesis Urdu (University of Sargodha, Sargodha, 2014), 188.